اسلام میں اختلاف کے آداب

حصّہ دوم

قرونِ خیر کے بعد اختلاف (۳)

ترجمہ وتلخیص جناب عبدالحی ابڑو صاحب ۔ اسلامی یونیورسٹی ۔ اسلام آباد

عہدِ حاضر میں اختلاف کے آداب یہ بات مسلّم ہے کہ زمانہ بدلنے کے ساتھ ساتھ اسبابِ اختلاف بھی بدلتے رہتے ہیں ۔ مگر گذشتہ عہد کے کچھ نہ کچھ اسباب نئے عہد کی طرف ضرور منتقل ہوتے ہیں ۔ عہدِ حاضر میں مسلمانوں کے اندر پائے جانے والے اختلاف کا نمایاں اور بنیادی سبب اسلام کے متعلق ان کی ناواقفیت وجہالت یا اس کے بارے میں ناقص علم کو قرار دیا جاسکتا ہے ۔

بلادِ اسلامیہ میں کافرانہ استعمار کے داخلے سے پہلے کے علمی ماحول کا ذکر تو آپ پڑھ چکے ہیں آئندہ سطور میں ہم استعماری قوتوں کے غلبہ کے بعد کے ان حالات کا جائزہ پیش کریں گے جس کے نتیجہ میں اس صورتِ حال میں مزید ابتری پیدا ہوئی ۔ استعماری طاقتیں یہ جان چکی تھیں کہ مسلمانوں کی فضیلت وعظمت کا راز کس چیز میں پنہاں ہے ۔ چنانچہ انہوں نے اپنی توجہ مسلمانوں کے نصابِ تعلیم اور ایسے اداروں کے قیام پر مرکوز کردی جن کے ذریعہ سے ان کی عقل اور اندازِ فکر پر اثر انداز ہوکر انہیں نئی صورتِ حال اور نئے عالمی نظریات کو قبول کرنے اور ان کے مطابق ڈھل جانے کے لیے تیار کرسکیں ۔

انہوں نے مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی پوری کوشش کی کہ مسلمان اس نئی صورتِ حال کو قبول

کرکے ترقی و کمال کی منازل طے کر سکتے ہیں جس طرح مغربی ممالک میں ہوا کہ تہذیب و تمدن کی شاہراہ پر انھوں نے اس وقت قدم رکھا جب مذہبی احکام سے بغاوت و سرکشی کی راہ اپنا کر کلیسا کی پابندیوں سے خود کو مکمل طور پر آزاد کر لیا۔ اُن کے خیال کے مطابق ہر مذہب متوقع ترقی و خوشحالی کی راہ میں انسانی پیش رفت کے لیے ایک زبردست رکاوٹ ہے۔ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا ” (الکھف:۵) ”بڑی بات ہے جو اُن کے منہ سے نکلتی ہے، وہ محض جھوٹ بکتے ہیں“۔

ان کا یہ دعواے دیگر تحریف شدہ مذاہب کے بارے میں تو درست ہو سکتا ہے، لیکن اسلام کے بارے میں ایسا دعویٰ یقیناً غلط اور غیر حقیقت پسندانہ ہے، جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی سعادت و خوشحالی وابستہ کر رکھی ہے۔ انسانیت اس نورِ خداوندی کی روشنی میں اپنی ساری اُمیدوں اور اُمنگوں کی تکمیل کر سکتی ہے۔

اُمتِ مسلمہ کا شیرازہ بکھیرنے اور اس کے اسلامی تشخص کو ختم کرنے کے لیے کافرانہ استعمار نے اسلامی تعلیم اور اس کے ذریعہ تعلیم یعنی عربی زبان کے لیے طرح طرح مشکلات اور رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے دیگر وسائل اپنانے کے ساتھ ساتھ ان طلبہ کے ساتھ بھی بے توجہی برتی جانے لگی، جنھیں دیگر طریقوں سے اسلامی تعلیم کی راہ سے ہٹانا اُن کے لیے مشکل تھا۔ ان کے بارے میں ایسے خیالات و افکار پھیلائے گئے جن سے ان کے مقام و مرتبہ کو دھچکا لگا۔ ان کی حیثیت گھٹی اور یہ علوم و فنون بے وقعت ہو کر رہ گئے۔ نتیجتاً معمولی درجے کے عہدوں اور مناصب سے بھی وہ محروم کر دیے گئے۔ اس کے مقابلے میں ایسے طلبہ پر خصوصی توجہ دی گئی جو جدید طرز کی درسگاہوں سے منسلک ہو کر وہاں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اس سلسلہ میں انھیں ہر طرح کی سہولتیں فراہم کی گئیں اور ان کے لیے روشن مستقبل کے دروازے کھول دیے گئے، تاکہ اُمتِ مسلمہ کی قیادت و حکمرانی کے مناصب انھیں کے لیے مخصوص ہو سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی تعلیم اور عربی زبان سیکھنے والے طلبہ کی تعداد محدود ہو کر رہ گئی۔ ان تمام مشکلات کے باوجود معدودے چند طالب علم اگر ادھر کا رُخ کرتے بھی تو انھیں عام طور پر ایسی سختیوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تو

وہ دل برداشتہ ہو کر اول تو یہ راستہ ہی چھوڑ دیتے، لیکن اگر کوئی جرأت کر کے آگے بڑھنا بھی چاہتا تو اس کے اور دوسروں کے درمیان مختلف عہدوں، ملازمتوں اور بڑے بڑے مناصب میں کئی قسم کے امتیازات برتے جاتے، جنہیں دیکھ کر انہیں ظلم و ناانصافی اور اپنی بے بسی کا شدید احساس ہوتا۔ یہ صورتِ حال اب تک جوں کی توں برقرار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر اسلامی ممالک میں اسلامی تعلیم کا معیار بہت گر گیا ہے۔ طالب علموں کی انتہائی قلیل و ضئیل تعداد اس طرف متوجہ ہوتی ہے۔ اور وہ بھی یہ جانتے ہوئے اس میدان میں اترتے ہیں کہ وہ جو کچھ کاشت کر رہے ہیں اس کا کاٹنا شاید ان کے مقدر میں نہ ہو۔ بہر حال ان تمام رکاوٹوں کے باوجود جو لوگ اس طرف متوجہ ہوتے ہیں، تکمیلِ علوم کے بعد عملی زندگی میں انہیں پھر شاید مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ چونکہ ان پر معاشرہ میں فعّال کردار ادا کرنے کے تمام دروازے بند کر دیے گئے ہیں لہٰذا وہ دعوتِ دین کا کام اور معاشرے کی اصلاح کے سلسلے میں اپنا فرض پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ ان بند دروازوں کے سامنے ان کا استقلال اور ثابت قدمی جواب دینے اور ان کی شخصیت کمزور پڑنے لگتی ہے اور وہ ایسے سرکاری مذہبی اداروں سے وابستہ ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو پہلے ہی سے چند لگے بندھے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔ جن سے ہٹ کر کوئی بھی کام کرنا ان کے بس میں نہیں ہوتا۔ اس طرح معاشرے میں جب وہ اپنا کردار ادا نہیں کر پاتے تو عام مسلمانوں کا ان پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔

اُمتِ مسلمہ کو اپنے عقائد سے برگشتہ کرنے اور ان کی شریعت سے وابستگی کو کمزور کرنے کے لیے کافرانہ استعمار نے عربی زبان اور اسلامی تعلیم کو ذیلی حیثیت دے کر اور اپنے پسندیدہ افکار و نظریات کے لیے میدان ہموار کر کے نوجوانانِ ملت کے لیے اسے بے حد پرکشش بنا دیا، مگر انہیں وہاں سے کانٹوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ملا۔ مسلمانوں کی نوجوان نسل نے کمیونزم، سوشلزم، قومیت اور اس طرح کی دیگر تحریکوں کو جنہیں ان کے سامنے خوشنما بنا کر پیش کیا گیا تھا اور جن تحریکوں اور نظریات نے اُمت کو پہلے سے زیادہ ذلت و رسوائی میں مبتلا کر دیا تھا، آزما لینے کے بعد بخوبی جان لیا کہ اسلام ہی اس اُمت کے تمام

مسائل ومشکلات کا واحد حل ہے۔ صرف وہی انہیں قعر مذلت سے نکال سکتا ہے اور اُمت کی پسماندگی کے اسباب کو دُور کر سکتا ہے۔ یہ بات بڑی خوش آئند تھی کہ ہمارے نوجوانوں میں مختلف راہوں میں بھٹکنے کے بعد اسلام کی طرف رُخ کرنے کا شعور بیدار ہوا اور انہیں اپنے دین وایمان اور وجود کو لاحق خطرات کا احساس ہونے لگا۔

اس سلسلہ میں انہیں دینی بصیرت پیدا کرنے اور شرعی احکام و مسائل جاننے کے ضمن میں پھر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ چونکہ ان کے سامنے کوئی مربوط تعلیمی نظام نہیں تھا جو اس سلسلہ میں ان کی رہنمائی کرتا، لہٰذا انہیں جو بھی کتابیں دستیاب ہوسکیں انھوں نے بطور خود ان سے استفادہ کی کوشش کی۔ دوسری طرف انہیں ایسے باصلاحیت اساتذہ بھی میسر نہ آسکے جو اُن کی مناسب رہنمائی کر سکتے، چنانچہ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ یہ کتابیں پڑھ کر اسلام کو انھوں نے ان کتابوں کے تناظر میں دیکھا۔ اور اس طرح اسلام کا ایک محدود گوشہ تو اُن کے سامنے آیا، مگر اسلام سے وہ کلی طور پر متعارف نہ ہوسکے اور ان کی نگاہوں سے اس کے اُصول و مقاصد اوجھل رہے۔ ان کی مثال ان اندھوں کی سی ہوگئی جو کسی ہاتھی کو اپنے ہاتھوں سے ٹٹول کر دیکھنا چاہتے تھے ——— جس کا ہاتھ جہاں پہنچا اس نے اس حصے کو مکمل ہاتھی سمجھ لیا۔ اسلام کے ساتھ مسلمانوں کا معاملہ انہی اندھوں والا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اُسے اپنی سُوجھ بُوجھ کے مطابق سمجھنے کے لیے کوشاں ہے۔ اس چیز نے انہیں مختلف جماعتوں اور چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بانٹ دیا ہے۔ ان لوگوں کی تو بات ہی کیا جو اسلام سے منہ موڑ کر اپنی خواہشاتِ نفسانی کے گھوڑے پر سوار اندھا دھند بھاگے جا رہے ہیں اور جس کا رُخ کبھی وہ مشرق کی طرف موڑ دیتے ہیں اور کبھی مغرب کی طرف، جب کہ اسلام سے اُن کا رشتہ بس اُن اسلامی ناموں کی حد تک محدود ہے جو انہیں موروثی طور پر ملے ہیں۔ اگر ذرا سی بھی شرم وحیا باقی نہ رہ جاتی تو وہ ان سے بھی جان چھڑوا لیتے۔ البتہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اسلام کے سایہ دار درخت کی جانب لوٹنا چاہتے ہیں۔ لیکن صحیح رہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے اس کے لیے وہ مختلف راہیں اختیار کرنے پر مجبور ہیں اور اس طرح ان میں اختلاف واقع ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ خود ان میں پھوٹ پڑتی

ہے بلکہ ان کے دشمنوں کو اُن پر غلبہ حاصل کرنے میں دشواری پیش نہیں آتی اور حکمرانوں کی لاٹھی بھی ان کا ہر جگہ پیچھا کرتی رہتی ہے۔

راہِ نجات اس اُمت کے مرض کی تشخیص کے بعد مندرجہ ذیل سطور میں ان کے علاج کی مختلف صورتوں کا سرسری جائزہ لیتے ہیں۔

۱- جو مخلص مسلم میدانِ دعوت و تبلیغ میں سرگرم عمل ہیں اور جنہیں اُمت کے اس المیہ سے سروکار ہے انہیں چاہیے کہ چند ذہین و فطین مسلم نوجوانوں کے ایک گروہ کا انتخاب کر کے علومِ شریعت کی تدریس کے لیے انہیں بہتر مواقع مہیا کریں اور ایسے باقی ماندہ علمائے شریعت کے زیرِ سایہ ان کی تربیت و تعلیم کا اہتمام کریں، جو علم و عمل، طہارت و تقویٰ، صحیح فکر و نظر، اسلام کے مفاد و اہداف کے ادراک اور علومِ اسلامیہ میں گہری بصیرت و تفقہ کے جامع ہوں اور ان کی عملی زندگی میں بھی ایک قابلِ تقلید نمونہ ہو۔ اس تربیت و تعلیم میں نبوی طریقِ کار ان کے لیے مشعلِ راہ ہونا چاہیے۔ نوجوانوں کے اس گروہ کو چند ایسے دوسرے نوجوانوں کے ذریعے تقویت پہنچائی جائے جو مختلف عصری علوم کے ماہر ہوں اور جو اخلاص و تقویٰ کے مرتبے پر بھی فائز ہوں۔ دونوں طرح کے یہ نوجوان مل کر سفر کا صحیح رُخ متعین کر سکتے ہیں اور اسلامی بیداری کی موجودہ لہر کی رہنمائی کر کے اُسے انحراف سے بچا سکتے ہیں، جس کے بعد اُمت کے لیے عافیت و چھٹکارے کا سامان ہو سکے گا۔ اور روز بروز تباہی کے گڑھے کی طرف بڑھنے والی انسانیت اس کی قیادت میں اپنا صحیح رُخ متعین کر سکے گی اور ظاہر ہے کہ اس کی نجات اسلام ہی میں مضمر ہے۔

۲- مسلمانوں کے فکری سفر اور سوچ میں اس طرح سے تبدیلی لائی جائے کہ اس سے اس فکری بحران کا علاج ہو سکے جس سے مسلمان آج کل دوچار ہیں۔ اور جس کے دُوررس اثرات و نتائج کا شعور کم ہی لوگوں کو ہے۔ یہ بحران مسلم اداروں کے زوال و انحطاط، مسلم تنظیموں کے نقصان، مسلم نوجوانوں کے ہاں علم و آگہی اور تربیت و تعلیم کے گرتے ہوئے معیار، باہمی تعلقات میں پھوٹ آنے، اور صالح گروہوں کی قابلِ قدر کوششوں کو ناکام بنانے کی تدبیروں سے عیاں ہو جاتا ہے۔ اس کا واحد سبب یہ ہے کہ اسلام اور اسلامی تعلیمات

کو میدانِ زندگی سے دوچار کیا جا چکا ہے۔ اسلام کے مثالی افکار و نظریات اور انسانیت کے درمیان خلیج گہری ہو چکی ہے۔ اسلام کے بارے میں یہ تاثر عام ہے کہ یہ ایک ایسا بادل ہے جو نہ تو برستا ہے اور نہ ہی مُردہ زمین میں زندگی کی نئی رُوح پھونک سکتا ہے۔ یا پھر اس کی مثال چکنے پتھر پر پڑنے والے پانی کی ہے جو کوئی کھیتی اگاتا ہے نہ کوئی سبزہ۔ کیونکہ دل سخت ہو چکے ہیں اور انھیں زنگ لگ چکا ہے اور آنکھیں خیرہ ہو چکی ہیں، جن کے اندر خیر و شر میں امتیاز کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔

مختلف تعلیمی ادارے اُمت کو معتدل مسلمان انسان دینے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ مسلم ممالک میں مغربی طرز پر جو یونی ورسٹیاں قائم ہیں وہ اپنی ذمہ یہ نہیں سمجھتیں کہ تمام شعبہ ہائے علوم میں ایسا ماہر مسلمان تیار کرنا ہے جو تمام علوم و معارف کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے کی قدرت رکھتا ہو، بلکہ اُن کا مطمحِ نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ ایسے طلبہ تیار کیے جائیں کہ جو مغربی علوم و فنون کے دلدادہ ہوں۔ اور جلد ہی اسلامی عقائد اور اسلامی نقطۂ نظر سے زندگی کے مقاصد و اہداف سے قطع تعلق کر لیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان یونی ورسٹیوں سے ایسی نسل نکلی جس کا اُمت سے تعلق و رابطہ کمزور، تعلقات پیچیدہ اور سوچ اُلجھی ہوئی ہے۔ اپنے علم کو اُمت کی ضرورت کے لیے استعمال کرنا ان کے بس میں نہیں ہے۔

دوسری طرف وہ تعلیمی ادارے جو شرعی و دینی مزاج رکھتے ہیں جیسے جامعہ الازہر اور اس جیسی دیگر اسلامی جامعات یا کالج و مدارس وغیرہ۔ انھوں نے محدود پیمانے پر تو چند شرعی علوم میں کچھ ماہرین پیدا کیے ہیں، لیکن یہ ادارے ایسے مستند علما پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں جو اُمت کی عملی اور فکری قیادت اور دین کی تجدید کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہوئے اسلام کو اس کے اصولوں اور اہداف و مقاصد کی روشنی میں اُمت کے سامنے پیش کرسکیں اور موجودہ دور کے چیلنجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ان پر غلبہ پاسکیں۔ اس بنا پر اسلامی فکر کا دائرہ تنگ ہوتا گیا۔ اور مسلمانوں کی زندگی اور اندازِ فکر پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی عقلیں تمام غیر اسلامی افکار و نظریات کو بھی قبول کرنے لگیں۔ اور مسلمان سیاست، معیشت اور معاشرت وغیرہ میں اپنے مسائل حل کرنے سے عاجز رہے

اور دوسروں کی اُلٹی سیدھی نقلیں کرنے لگے۔ فرزندانِ اُمت کی باہمی رسّہ کشیوں نے اُمت کی اقدار و روایات اور اُصولوں کے بندھنوں کو توڑ ڈالا۔ یہ باہمی تصادم عام طور پر مغرب سے متاثر اور اس کی ثقافت کے فریفتہ گروہ کے حق میں مفید ہوتا ہے۔ مقامِ افسوس ہے کہ یہ مومن ہراول دستہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنے اور چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی بجائے خود ہی جھگڑوں اور اختلافی مسائل کا شکار ہو گیا۔ کیونکہ اکثر مسلمانوں کے ذہن میں جزئیات و کلیات اور مقاصد و مبادی باہم گڈمڈ ہو گئے ہیں۔

ہمیں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ کتاب و سنّت کی روشنی میں اسلام کی رُوح، اس کے مقاصد و قواعد کلیہ اور مسائل و احکام کے مراتب کے شعور و ادراک کی بنیاد پر قائم کردہ صحیح اسلامی سوچ پیدا کریں۔ قرونِ خیر میں سلفِ صالحین کتاب و سنّت سے جس طرح استفادہ کرتے تھے اس اسلوب کو سمجھنے کی ضرورت ہے تاکہ اس کے ذریعے اُمت کے مسائل کو اسلام کے تصورات اور اس کے پیش کردہ حل کے مطابق نمٹا سکیں اور افرادِ اُمت کو اس بات کا پورا پورا یقین حاصل ہو سکے کہ اسلام ہی راہ نجات اور تمام مشکلات کا واحد حل ہے۔ یہی یقین اُمتِ مسلمہ کو اسلام کی فکری بنیادوں کے ساتھ شعور و بصیرت کے ساتھ اس طرح سے ربط گہرا کرنے پر مجبور کر دے گا کہ اس کے بعد شیطان اُسے کاٹ کر علیحدہ نہیں کر سکتا۔ اُمتِ مسلمہ جب خوابِ غفلت سے بیدار ہو گی اور مرض کی صحیح تشخیص کر لے گی تو ایسے طریقے اسے خود بخود نظر آئیں گے (اور انہیں اختیار کیے بغیر ان کے لیے کوئی چارۂ کار نہ ہوگا) جن کے ذریعے اس کے مرض کا علاج ہو سکے اور وہ اُسے اپنے مقصد تک پہنچا سکیں۔ ان شاء اللہ وہ دن دُور نہیں۔

مسلمانوں کو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ اسلامی اخوت و اتحاد کی حفاظت، اور اس کو کمزور کرنے اور نقصان پہنچانے والی چیزوں کو راستے سے ہٹانا مسلمانوں کا سب سے اہم فریضہ اور سب سے بڑی عبادت ہے کیونکہ اسی اخوت کے ذریعے ہی ہم ان ساری مشکلات پر قابو پا سکتے ہیں، جو اسلامی نشاۃ ثانیہ کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہیں ___ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تفرقہ اندازی کو سخت ناپسند فرماتے ہوئے اس سے دُور

رہنے کی تلقین فرمائی ہے اور مسلمانوں کی جماعت کے اندر نفاق و افتراق پیدا کرنے والے کا خون مباح قرار دیا ہے۔ اس لیے محض اختلاف رائے کی وجہ سے اسلامی اخوت کے تقاضوں کی ادائیگی میں کوتاہی کرنا یا اُسے نقصان پہنچانا کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں۔ بالخصوص موجودہ حالات میں جب کہ کفر کی ساری قوتیں ہم سے نبردآزما ہیں اور ان کی خواہش و کوشش ہے کہ ایمان کی بھڑکتی ہوئی چنگاری کو بجھا دیں۔

اخوت اور مسلمانوں سے محبت و اتحاد پہلا بنیادی فریضہ ہے جس کا حکم ہمیں خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے کیونکہ توحید سے اس کا قریبی تعلق ہے۔ اسی طرح اخوتِ اسلامی کے خلاف کوئی قدم اُٹھانا بھی ممنوعات و منکرات میں سرفہرست ہیں۔ اسی لیے علمائے سلف اختلاف سے بچنے اور مسلمانوں کے باہمی ربط و تعلق کو برقرار رکھنے کی خاطر افضل کو چھوڑ کر مفضول پر عمل کر لیتے تھے اور جو امر اُن کی نظر میں مستحب و مندوب ہوتا کبھی کبھی اُسے چھوڑ کر جائز ہی پر اکتفا کر لیتے۔ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

" ایک دوسرے کی اقتدا میں نماز پڑھنے پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے، جس طرح صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور ان کے بعد ائمہ اربعہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ اس کا منکر بدعتی، گمراہ، کتاب و سنّت اور اجماعِ اُمت کی خلاف ورزی کا مرتکب ہے۔ صحابہ و تابعین اور اُن کے بعد آنے والے حضرات میں سے کچھ بسم اللہ پڑھ کر (نماز میں قراءۃ کا) آغاز کرتے تھے اور کچھ ایسا نہیں کرتے تھے۔ اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھ لیتے تھے، جیسے امام ابوحنیفہؒ، ان کے رفقا، اور امام شافعیؒ وغیرہم، مدینہ کے مالکی ائمہ کی اقتدا میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ اگرچہ وہ زور سے یا آہستہ بسم اللہ نہیں پڑھتے تھے۔ امام ابویوسفؒ نے خلیفہ ہارون الرشید کے پیچھے نماز پڑھی جس نے پچھنا لگوا رکھا تھا۔ امام مالکؒ نے اسے وضو واجب نہ ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ امام ابویوسفؒ نے اس کے پیچھے نماز پڑھ لی اور اس کا) اعادہ نہیں کیا۔ امام احمد کے نزدیک نکسیر پھوٹنے اور پچھنا لگوانے سے وضو ٹوٹ

جاتا ہے۔ ان سے کسی نے پوچھا۔ اگر امام کے بدن سے خون نکل جائے اور وہ وضو نہ کرے تو کیا میں اُس کے پیچھے نماز پڑھ لوں؟ آپ نے کہا: بھلا سعید بن المسیبؒ اور مالکؒ کے پیچھے بھی تم نماز نہیں پڑھو گے؟"[1]

اسلامی اخوت اور اتحاد بین المسلمین کی تاکید کا یہ مطلب نہیں کہ بنیادی عقائد جن میں مسلمہ قواعد کے مطابق کسی تاویل کی گنجائش نہ ہو اس میں بھی سستی اور تغافل برتا جائے۔ اور دشمنانِ دین وملت سے برسر پیکار ہونے کے لیے اخوتِ اسلامی کو برقرار رکھنے کے شوق میں ہم اپنا ہاتھ ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دیں جو صرف نام کے مسلمان ہیں۔ اختلافی مسائل جن سے باہمی انتشار وافتراق نہیں ہونا چاہیے۔ بس وہی ہیں جنہیں ائمہ سلف نے مانا ہے۔ ان کے حدود آداب میں داخل رہے اور ان کے پاس مختلف وجوہ سے ایسے اختلاف کے جواز کے دلائل موجود تھے۔

اول وآخر سب سے اہم چیز یہ ہے کہ ظاہری وباطنی ہر طرح انسان کو اپنے دل میں اللہ کی خشیت وتقوٰی کو جاگزیں کرنا چاہیے۔ اتفاق ہو یا اختلاف ہر حالت میں ہمیں اس کی خوشنودی اور رضامندی کا طلب گار ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ دینی بصیرت وتفقہ پیدا کرنا نفسانیت سے کنارہ کشی، شیطانی وسوسوں سے ہمیشہ دور رہنا، ابلیس کی چالوں سے باخبر ہونا اور اس کی چال میں پھنسنے سے اجتناب بھی بہت ضروری ہے۔

---

[1] الفوائد العدیدۃ (شیخ منقور): ۲/۱۸۱